چند رے شاہ ذی جاہ نے توقف کیا۔پھر گویا ہوا۔۔۔''یہ شرط انصاف نہیں کہ جو شرط میں نے پیش کی اس میں سبقت لے جانے والے کو حوالے سلطنت نہ کروں ۔یاد رکھو بادشاہت کے لئے انصاف اول و آخر شرط ہے اور یہ حقیقت کیسے جھٹلائی جائے کہ کبھی کبھی وہی چیز جو ہمیں بری لگتی ہے، ہماری بھلائی کے لیے اہم ہو اور وہ چیز جس پر ہم فریفتہ ہوں، ہمیں تباہی کی جانب کھینچے ۔کون جانے اسی سادہ لوح میں رعایا کی فلاح ہو اور تمہارے علوم کی دسترس منہ دیکھتی رہ جائے ۔

سنا ہے سب سے چھوٹا شہزادہ برسوں حکمران رہا۔بڑے شہزادوں کا سارا وقت بغاوت ،سازش اور رزم گاہوں میں گزرا ۔بادشاہ چونکہ انصاف کے علاوہ کسی اور وصف سے آراستہ نہ تھا اس لئے اس کے عہد میں شیر اور بکری ایک ہی گھاٹ پانی پیتے رہے اور رعایا فلاح اور امن سے وابستہ خوشی اور خوشحالی کی زندگی بسر کرتی رہی ۔

میں آج تک یہ روز نہ جان سکا کہ بعض کو بعض پر سبقت کیوں حاصل ہو جاتی ہے ؟کسی ایک وصف سے بیڑا پار کیسے ہو جاتا ہے؟ چاچا محمد صمد میں وہ کونسی خوبی تھی جس کی بنا پر وہ ہر دلعزیز ٹھہرا اور میرا باپ جس کی ساری زندگی ذمہ داریاں اٹھاتے ،وعدے نبھاتے ،ناک کی سیدھ چلتے چلتے گزری ،نہ اپنے لیے خوشی حاصل کر سکا نہ کسی اور کو مسرت کے حوالے کر سکا؟ بعض کو بعض پر ترجیح کیا کسی خوبی ،محنت، منطقی چناؤ کے باعث ہے کہ یہ اوپر والے کی مرضی کی مرہون منت ہو اور جس کی لاجک تک ابھی انسان پہنچ نہیں پایا۔''

جرمن ٹاؤن کے اس محلے میں صفائی ستھرائی کا یہ عالم ہے کہ کبھی کسی کھڑکی دیوار پکی پگڈنڈی پا کاغذ، مٹی، گھاس ،کا تنکا بھی نظر نہ آیا۔میں بیلکونی میں بیٹھ کر سڑک کا نظارہ کرتا رہتا۔ہر پیر اور ہفتے کے روز گندی گاڑی آتی اس میں بڑے مظبوط جسموں والے نیلی رودیاں پہنے نیگرو، امریکن اور دوسرے تارکین وطن باہر نکلتے اور گھروں

سے باہر رکھے ہوئے پلاسٹک کے کالے ڈرموں میں سے کوڑا کرکٹ اٹھا کر لے جاتے۔نہ سگریٹ پینے کے بہانے بیٹھتے،نہ ہی کسی دوسرے پر کام چھوڑ کر خود چمپت ہو جاتے۔ہمارے دیس میں عام طور پر نماز پ

ڑھنے کے بہانے کارندے جاتے ہیں اور پھر لوٹ کر آفس میں واپس ہی نہیں آتے۔جمعے کے روز تو معمول ہوتا کہ گو دفتر پانچ بجے تک کھلیں لیکن واپسی کی نفری ضرور کم ہو جاتی۔سایداسی دکھ کے کارن بھٹو کے عہد حکومت نے جمعے کو سرکاری تعطیل ہی میں بدل دیا گیا لیکن بات پھر بھی نہ بنی کہ اس طرح ہفتے میں تین چھٹیاں رہنے لگیں۔جمعے کو سرکاری چھٹی ہفتے کو فرنچ لیو اور اتوار کو سرکاری انگشیہ کی رسم کے مطابق چھٹی ہی سمجھی جانے لگی۔

منگل کے روز گھاس کاٹنے والے آے اکرتے ہیں گھاس کاٹنے کے لیے عموماً ایسے طالبعلم ہوتے تھے جو اپنے سکول یا کالج کی فیس اکھٹی کرنے کے لیے یہ کام کرتے۔ایک گھاس کاٹنے والی چھوٹی سی گاڑی آتی جسے طالب علم کار کی طرح طلاتا اور موئی موئی گھاس کاٹتا جاتا ہے اس کے بعد ایک نوجوان لمبی بندوق نما مشین لایا جس کے سامنے چوخی میں گھاس کاٹنے کی پھرکی لگی ہوتی اور پھر کونے کھدروں میں سے ناممکن جھگوں سے بھی گھاس کاٹ جاتی۔۔۔۔۔

نہ تو کوڑا اٹھانے والے نہ گھاس کاٹنے والے نہ ہی شیشے صاف کرنے والوں کو کام کرنے میں کوئی دقت تھی۔اپنے اپنے وقت پر آتے اور کام کرنے کے بعد پھر سے اڑ جاتے۔۔۔۔پرندوں کی طرح یہاں نہ ڈراوغہ صفائی تھا نہ کوئی ایس میٹ جو کام کروائے مکھی کے چھتے کی طرح سارے کارکن پابندی کار تھے۔ان ربوٹوں کو دیکھ کر مجھے خیال آتا کہ یہ کیسی دنیا ہے،کیسا نظام ہے۔۔۔۔جہاں کام ہوتے چلے جاتے ہیں۔نہ کوئی شخص روڑا بنتا ہے نہ کسی کو روکاوٹ بننے پر آمادہ کرتا ہے۔

دراصل امریکہ میں ساری اخلاقیات کام کی اخلاقیات کے بعد آتی ہیں اس معاشرے میں اسی انسان کی عزت ہوتی ہے جو کام میں پورا اترتا ہے۔سب کا رشتہ کام سے گہرا ہے اور فرد کا فرد سے رشتہ ناطہ اغراض کے باعث نہیں بلکہ ذاتی خوچی پر منحصر ہے۔یہاں سب کلام کی اہمیت کے لئے جڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔۔۔۔۔

یہ اور بات ہے کہ ابھی ایسی گوند ایجاد نہیں ہوئی جو انسان کو انسان سے مستقلاً جوڑ سے۔۔۔۔انسان ہمیشہ اپنی فردیت قائم رکھنا چاہتا ہے کسی اور میں نہ ضم ہوتا ہے اور کسی اور کو اپنے میں ضم ہونے کی اجازت دیتا ہے امریکہ میں بچھڑنے کا سلسلہ اور بھی تیز ہے۔یہ لوگ دل شکستہ کو کر بھی Move On کرنا جانتے ہیں۔

''ابا جی آپ سارا دن بور تو نہیں ہوتے۔۔۔۔''بلال بہت مودّب ہو کر پوچھتا ہے۔

''اوہ نہیں بابا۔۔۔میں نے کہا بور ہونا ہے اس عمر میں''

''میں آپ کو اس ویک اینڈ پر نیویارک لے جاؤں یا آپ واشنگٹن ڈی سی جائیں گے میرے ساتھ۔''

''تم میری فکر نہ کرو بلال میں ایک مدت سے آزاد محسوس کر رہا ہوں۔۔۔۔''

بلال میرا داماد ہے،وہ ہر روز تازہ شیو کے بعد نیلگوں چہرہ لئے بریک فاسٹ ٹیبل پر آتا ہے۔الیکٹرک کیتلی میں چائے کے لئے پانی چڑھانے کے بعد وہ کئی چھوٹے موٹے کام کرتا ہے سب سے پہلے وہ ڈش واشر میں سے برتن نکال کر باورچی خانے کی Cabinets میں رکھتا ہے ان Cabinets کو ہمارے ملک میں الماریاں کہا جاتا تھا،ان میں ٹھکا ٹھک کٹا کٹ برتن دھرنے کے بعد وہ اپنے اور میرے لئے ٹی بیگز لے کر چائے بناتا ہے اس چائے کا لطف کبھی کڑک چائے جیسا

نہیں ہوسکتا ،لیکن ڈاکٹر بلال پچھلے ڈائقے بھلا چکا ہے ۔وہ سری پائے ،نکا ٹک ،نہاری، قیمے والے نان یاد نہیں کرتا ۔ایک مدت سے اس کی زندگی مشینی ہے ۔وہ عقل کے سہارے زندہ رہتا ہے ۔ہم دونوں سب سے پہلے ناشتہ کرتے ہیں میری بیٹی اور اس کے دونوں بیٹے گھر سے ذرا لیٹ جاتے ہیں بلال کے ساتھ میری بے تکلفی نہیں ہوسکی ۔کچھ حد تک میں آگے بڑھتا ہوں لیکن پھر خار پشت کی طرح میرے کانٹے کھڑے ہوجاتے ہیں ۔میں کسی کو اپنے جھانکنے کی اجازت نہیں دے سکت ۔کیونکہ زندگی کی کسی سٹیج پر مجھے علم ہو چکا ہے کہ رازداں ہمیشہ آپ کی کمزوریوں کو واشگاف کر کے انہیں استعمال کرنے کا فن بھی بخوبی جانتا ہے۔

بلال کچن اور ڈرائنگ ٹیبل تک کئی مرتبہ آتا جاتا ہے رہتا ہے ۔کبھی ٹوسٹر سے ٹوسٹ برآمد کرنے ،کبھی چیز اور جیم نکالنے ۔۔۔۔اس لئے میں ناشتہ میں انڈہ نہیں کھاتا کہ پھر اسے یہ سروس بھی کرنا پڑے گی ۔سارا دن ہسپتال مین سر کھپانے کے بعد جب وہ گھر پہنچتا ہے تو اسے کئی دوسرے کام کرنا ہوتے ہیں گروسریز بھی وہی لاتا ہے، کیونکہ میری بیٹی کام پر دیر سے جاتی ہے اور دیر سے ہی لوٹتی ہے ۔بلال عموماً دماغی طور پر غیر حاضر رہتا ہے ۔مغربی لوگوں کا خدا کام ہے۔۔۔۔ہر تیسرا آدمی Workaholic ہے ۔اس کی اخلاقیات میں سرفہرست محنت کی اخلاق قدر ہے۔۔وہ کام میں چوری نہیں کرتا ۔اپنے Emploees کا ان وقت ضائع نہیں کرتا ۔Work ethics نے اسے مشینی بننے میں مدد دی ہے اسی لئے بالآخر اسے کام سے بریک درکار ہوتی ہے اور وہ پورے پانچ دن مشین بنا ویک اینڈ کا انتظار کرتا رہتا ہے جن اس کے جسم کو تفریح اور آرام کی گریس دی جاسکے۔

''کبھی تم نے سوچا بلالا؟''

''کیا ابا جی۔۔۔۔؟''

''واپس جانے کے متعلق ـــــ وطن میں لوٹنے کی آرزو کبھی بیدار ہوئی تم میں۔''

وہ زہر خند کے ساتھ مسکرا کر جواب دیتا ہے ـــــ ''شروع شروع تو ٹلجیا ہوتا تھا اباجی لیکن اب فیصلہ ہو چکا ہے۔اب پیچھے دیکھوں گا تو پتھر کا بن جاؤں گا۔''

''وہاں تمہارے سٹیٹس کا آدمی عیش کرتا ہے دو دو ڈرائیور ـــــ محل جیسا گھر آٹھ سات ملازم ـــــ بچوں کے لئے فلپچو میڈ ،دو ساز کمپنیوں کی طرف سے یورپ امریکہ کے مفت سفر ـــــ جس قدر تم کماتے ہو بادشاہوں کی طرح رہ سکتے ہو وہاں ـــــ''

''پاکستان امیروں کی جنت ہے ابا جی ـــــ امریکہ غریبوں کا بہشت ہے۔یہاں غریب آدمی عزت نفس سے محروم نہیں ہوتا۔وہ نہ اپنے آپ کو کسی سے کمتر سمجھتا ہے نہ ہی کمتر ہوتا ہے آپ کے دیس میں ـــــ''

''کیا وہ تمہارا ملک نہیں ہے بلال؟ ـــــ میں سوال کرتا ہوں وہ جواب نہیں دے پاتا۔

بلال گھڑی دیکھتا ہے اسے آدھے گھنٹے کی ڈرائیو کر کے ہسپتال پہنچنا ہے اور بقول اس کے وہ کبھی لیٹ نہیں ہوا۔

''ابو جی ـــــ جب میں وہاں لاہور میں تھا تو پورے تین سال ملازمت کے لئے کوشش کرنے کے باوجود بیکار تھا۔یہاں آ کر میں بڑے دھکے کھائے۔ارجمند اور میں نے بڑی مشقتیں جھیلیں،آپ کبھی اس سے پوچھئے گا۔کیا کیا پاپڑ نہیں بیلے ہم نے ـــــ لیکن آج جو کچھ آپ دیکھ رہے ہیں ، اسی امریکہ نے ہمیں دیا ہے ـــــ''

''لیکن میرے نزدیک تو ابھی بھی تم دونوں کی مشقت کم نہیں ہوئی ـــــ جس

قدر کام تم اور ارجمند یہاں کرتے ہو اس کا تو تصور بھی پاکستان کے نوجوان نہیں کر سکتے ۔۔۔۔ پہلے دفتروں میں پستے ہو، پھر گھر آ کر گھریلو ملازم بن جاتے ہو، یہ بھی کوئی زندگی ہے ۔۔۔۔ کوئی فراغت نہیں آرام نہیں ۔۔۔۔ گھڑی بن ہو گھڑی"

"ٹھیک ہم کام کے عادی ہو گئے ہیں ابا جی ۔ آپ فکر نہ کریں ۔ کام ہماری زندگی ،خوشی،سکون ہے ۔۔۔۔ یہاں کام مشقت نہیں لگن ہے لگن ۔۔۔۔"

وہ اپنا بریف کیس لے کر گھر سے باہر نکلتا ہے ۔ اسے اپنے ہسپتال تک پہنچنے کے لئے آدھا گھنٹہ درکار ہے ۔ چار پانچ جملے بولنے میں اس کا وقت ضائع ہو جاتا ہے اس کی پاداش میں اسے گاڑی تیز چلانی پڑتی ہے ۔۔۔۔ Stress میں جانا پڑتا ہے ۔

امریکہ میں لوگ ڈالر نہیں بچاتے وقت بچاتے ہیں ۔ پھر جب وقت کا صحیح مصرف ہونے لگتا ہے تو ڈالر خود ہی پانداز ہونے لگتے ہیں ۔ اس طرح ایک خاص قسم کی Frustration جنم لیتی ہے ۔ مایا داس پر دولت کا بوجھ خود بخود بڑھتا ہے ۔ دولت اپنی مشغولیات خود بڑھاتی ہے ۔ محل نما گھر ان گھروں کے انتظاما، بیرونی ممالک کے سفر، Designer کپڑوں اور جوتوں کی تلاش، دولت کی بنا پر شہرت کی ہوس ۔۔۔۔ پارٹیاں، پی آر، پرسنیلٹی پروبلمز نفسیاتی بیماریوں کا لا تخل سلسلہ جاری ہو جاتا ہے جب ڈالر بچنے لگتے ہیں تو پھر ایک اور قسم کا Stress شروع ہا جاتا ہے ڈراصل یہاں وہاں انسا پوری کوشش کرتا ہے کہ وہ ذہنی دباؤ سے نکلے ۔ اظمانیت قلب،سکون اور شانتی ملے ۔۔۔۔ لیکن شاید معیشت اور معاشیات کو یہ کچھ درکار نہیں ۔ زندگی کا اصل راز اسی Stress میں ہے ۔۔۔۔ یہ اور بات ہے کہ فلاح کے راستے پر چلنے والے دباؤ کی گھڑی سر سے اتار کر ملکوتی مسکراہٹ کے ساتھ گرد وپیش میں ٹھنڈی چاندنی کی طرح پھرتے ہیں ۔ نہ جہاں سوزی کا باعث بنتے ہیں نہ خود سوزی کا ۔۔۔۔ لیکن اس سکون کے نسخے کا Patent وہ ایسی جگہ کراتے ہیں، جہاں سے

نبیوں کا نسخہ سکون میسر آتا ہے اور اسے کسی اور زبان میں لکھا جاتا ہے۔

جب ہم ساندہ میں رہا کرتے تھے تو نچلی منزل میں ہمارا قیال تھا اور اوپر والی منزل کے اکلوتے کمرے میں شاہد بھائی رہا کرتے تھے۔ نیچے صرف تین کمرے تھے ۔ایک تو بیٹھک تھی جس میں بید کی کرسیوں کو لٹھے کی چولیاں پہنا کر پردہ پوش شکل دی گئی تھی ۔ایک کمرہ ابو امی کا تھا جس میں زیادہ وقت ابو اکیلے رہا کرتے ۔دوسرے کمرے آپیا چودھرائن تھیں اور ہم تینوں چھوٹے بہن بھائی کو سانٹا مارکرسٹ ڈاؤن سٹینڈ اپ کرایا کرتی تھیں ۔وہ میرے ہوش سے پہلے کی استانی تھیں ۔ان کو یہ زعم تھا کہ وہ ساری کائنات سے بہتر جانتی ہیں۔

انسان کو غالباً سب سے زیادہ تحکم کا شوق ہے۔وہ دوسروں پر کبھی رعب کبھی خوشامد، کبھی سزا دے کر اپنی حکومت کا ثبوت اپنی انا کو پہنچاتا رہتا ہے۔تحکم زیادہ ہوتا چلا جائے تو خود اعتمادی میں بھی اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے دوسروں کی مرضی پر اپنی مرضی مسلط کرنے کے مواقع کم ہوں تو احساس کمتری بڑھنے لگتا ہے۔مذہب، قانون، ماں باپ، استاد، رسم و رواج کسی قسم کی بھی اطاعت ہو تو انسان تابع کی حیثیت میں فیصلے کرتا ہے اسے فیصلوں کے لیے اپنے اندر کے بجائے باہر کی آواز حق پر اعتماد کرنا پڑتا ہے۔ماننے والے پر سے فیصلے کی ذمہ داری اٹھ جاتی ہے۔اس بوجھ کے اٹھتے ہی وہ صاحب اختیار بھی نہیں رہتا اور اسی لیے اپنے پر بھروسہ کرنا اس کے لیے مشکل ہو جاتا ہے ترقی کے لئے اپنے فیصلے پر اعتماد کرنا انتہائی اہم ہے۔اسی خود اعتمادی کے سہارے مغربی معاشرے میں ترقی کا پہیہ جام نہیں ہوتا ۔ہمارے گھر میں بھی غلطی کرنے کی اجازت نہ تھی ۔چونکہ ہم غلطیاں کرنے کے عادی نہ تھے اس لیے معافی مانگنے کا رواج بھی عام نہ تھا۔معافی مانگتے وقت ہم عجیب قسم کے گونگے، ضدی اور

شرمسار سے کونے کھدروں میں چھپتے پھرتے ۔ہم تینوں چھوٹے مدح وزم کے لئے آپا رفعت کی طرف دیکھتے رہتے ۔وہاں سے صادل جاتی تو ہمارے چہرے کل اٹھتے ۔گھور کر دیکھ لیتیں تو مرنے کا مقام ہوتا۔

''سنا نہیں کہا کہہ رہی ہوں میں۔''

''جی آپیا۔۔۔۔۔''

''چلو سیدھی طرح اور نہاؤ۔۔۔''

ٹھٹھرتی سردی میں جب گلی میں دھند کے باعث کچھ نظر نہ آتا، نہانے کا حکم ملا کرتا ۔ہم قریب قریب برفیلے پانی سے نہا کر باہر نکلتے تو آپیا کانوں کے پیچھے گردن کے سامنے ناخنوں کو الٹا پلٹا کر حکم دیتیں ''چلو اب ناشتہ کرو۔۔۔دیر نہ لگے۔سکول کا وقت ہو گیا ہے۔''

اسی طرح ٹھٹھرتے، کانپتے فریدہ اور ظفر سکول پہنچتے تو ماسٹر غلام نبی ٹکر جاتے ۔وہ سخت کلامی کے ساتھ ساتھ ہاتھ چلا کی بھی کرتے ۔جب انہیں غصہ آجاتا تو جہاں کہیں دل چاہتا، مکا چنکی تھپڑ رسید کرتے اور لمحہ بھر کو بھی احساس جرم انہیں نہ ستاتا ۔انہوں نے خود اتنی سخت قسم کی زندگی بسر کی تھی کہ کسی سے نرمی برتنا انہیں اسراف لگتا، ان کا بس چلتا تو تفریح کی گھنٹی بھی بند کرا دیتے ۔ہنستے، مسکراتے، چہکتے، بولتے شرارتیں کرتے چہرے پر وہ عذاب بن کر نازل ہونے کو ڈسپلن کا نام دیتے تھے۔

واپسی پر پھر رفعت آپا کا تحکم سہنا پڑتا ۔ہوم ورک، کھانا، دوسرے دن کا یونیفارم تیار کرنا، بستر بچھانا، استری کرنا، یہ سارے مشاغل ان کی مرضی کے مطابق ہوتے ۔وہ جب ہمیں جلد سلانے دینے میں کامیاب ہو جاتیں تو دونوں پوریٹوں کو چین پڑ جاتا ۔ہم آپیا سے چھوٹ جاتے، بڑی ہونے کے ناطے انہیں کچھ ایسے حقوق حاصل تھے جن کا ہم تصور بھی نہ کر سکتے تھے ۔مجھ پر فسٹ ایر کا سال بھاری تھا، کبھی کبھی مجھے نیند نہ

آتی۔

ساندہ کلاں کا یہ گھرانہ پرانا تھا۔اس میں کئی برسوں سے سفیدیاں نہ ہوئی تھیں ہمارے کمرے کی سفیدی جا بجا سے اکھڑی ہوئی تھی آپیا کے ڈر سے میں آنکھیں تو بند کر لیتا لیکن نیند کوسوں دور ہوتی۔میری دائیں جانب کھڑکی میں سے سٹریٹ لائیٹ آتی تھی،اس کی روشنی سیدھی اس طرف پڑتی تھی جس طرف ظفر سوتا تھا۔اسی دیوار پر سفیدی کچھ اس طرح اکھڑی تھی کہ ایک چیتا اندھیرے میں لپکتا دیکھتے ہی دیکھتے رنگ اختیار کر لیتا۔اس کی آنکھیں زرد شعلے برسانے لگتیں۔۔۔۔چہرے آہستہ آہستہ ٹوٹی پھوٹی دیوار کی سفیدی سے بنی ہوئی یہ وہم وگمان کی شبیہ مجھے حقیقتاً رضائی یا چادر سے چہرہ ڈھانپنے پر مجبور کر دیتی آج بیلکونی میں بیٹھے بیٹھے چیتا مجھے ایک بار پھر یاد آ گیا۔۔۔۔میری زندگی مین وہ غم اور مظالم زیادہ تھے جنہیں ایسے چیتوں نے مجھ پر وار رکھا جو حقیقت میں موجود نہ تھے۔ہمارے گھرانے پر پاکستان کے اور اللہ کے احسانات ہی احسانات تھے،لیکن ہم نے اپنے شکوک وشبہات سے آستینوں میں چھپے بتان وگمان کی مدد سے زندگی میں زہر گھولنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔۔۔۔ہم ان لوگوں سے خائف تھے جو ہماری طرح مہاجر اربے یارومددگار تھے۔۔۔۔ہم ان تعلیم گاہوں سے خوفزدہ تھے جہاں پر ھنے والے اور ہم بھی طالب علم نا آشنا چہروں والے تھے۔۔۔۔ہم شہر کی سڑکوں بازاروں،بس سٹاپوں کو دیکھتے رہتے۔خوف کے چیتے ہمیں ہر موڑ پر ہر نئی شکل میں کسی نئے واقعہ کی ہیبت سے ڈراتے۔

ہم ہجرت کے ساتھ ہی یہ خوف نام چیتے لے کر آئے تھے۔۔۔۔ہم تو ان شہروں ،گھروں،سڑکوں سے بھی ناواقف تھے جن کو ہمیں اپنانا تھا۔ہر موڑ پر وہی چیتا لپکتا چلا آتا تھا۔

اَن دیکھے کا کوف

اَن جانے کا خوف

اَن چکھے کا خوف

اَن چاہے کا خوف ۔۔۔۔

وہم و گمان کا چیتا نئی شکلیں بنا کر ہمارے تعقب مین رہتا اور ہم اس سے ایسے بھاگتے جیسے پولیس سے چور بھاگتا ہے۔نہ ہم کہیں ٹھرتے نہ کسی مقام سے آشنائی حاصل کر سکتے ۔یوں پاکستان میں ہمارا سفر چیتا جھپٹی سے شروع ہوا۔

تین خوش فہمیاں، جن میں عموماً لوگ زندہ رہتے ہیں ۔

میں خوش ہوں کہ میں ایسی گلی میں بڑھا پلا، جہاں سب ایک دوسرے کو جانتے تھے۔

میں خوش ہوں کہ ایسے آزاد ملک میں پرورش پائی، جہاں کسی کو کسی سے سروکار نہیں ۔تیسری خوش فہمی یہ ہے کہ میرے وطن کے لوگ سب سے اچھے ہیں اور یہاں کوئی برائی نہیں۔

ارجمند سلور سپرنگ جاتی ہے۔ہر صبح بچوں کو منٹگمری کالج سے ملحق سکول میں ڈراپ کرنے کے بعد وہ پورے چالیس منٹ میں ہسپتال پہنچ جاتی ہے، جہاں اس کا شمار پیرا میڈیکل سٹاف میں شمار ہوتا ہے۔وہ ایک امریکن ڈاکٹر کی receptionist ہے۔اس کی چلت پھرت میں بڑا اعتماد ہے۔اس کا لباس تو ویسا شوخ و شنگ نہیں جیسا وہ لاہور میں پہنتی تھی ۔لیکن اس کے انداز بہت شوخ ہو چکے ہیں ۔امریکنوں کی طرح وہ جینز ٹی شرٹ پہنتی ہے۔کبھی کبھی جب ہسپتال میں کافی فارٹی یا گٹ ٹوگیدر ہوتا ہے وہ سکرٹ اور بلاؤز بھی پہن لیتی ہے۔ایسے میں اس کی

ٹانگیں سکرٹ کی بیک سلٹ کی وجہ سے پنڈلیوں تک نظر آتی ہیں اور بلاؤز بھی وہ کچھ ایسے اہتمام سے پہنتی کہ اوپر سینے سے دو تین بٹن کھلے ہی ہوتے ہیں۔ارجمند کو امریکی لباس پسند ہے۔وہ کہتی ہے یہ امریکی لباس بہت پریکٹیکل ہے۔۔۔۔اس میں کاکرنا دشوار نہیں۔

ابھی مجھے جرمن ٹاؤن میں آئے بہت دن نہیں ہوئے تھے۔ایک دن میں نے ارجمند سے پوچھا۔۔۔۔"یہ تم نے اپنی شلوار قمیض کیوں چھوڑ دی ارجمند؟۔۔۔۔۔"

ارجمند کچھ دیر منہ میں زبان گھماتی رہی۔شاید وہ مجھے اپنی بات سے زخمی نہیں کرنا چاہتی تھی۔

"بات یہ ہے ابو۔۔۔انسان کو پانی کی رو کے ساتھ بہنا پڑتا ہے۔میں شلوار قمیض میں بہت Odd محسوس کرتی ہوں۔۔۔۔mainstream سے کٹ جاتا ہے آدمی۔"

"لیکن اپنی شناخت تو رہتی ہے نا ارجمند۔۔۔۔"

"ہاں رہتی تو ہے ابو۔۔۔۔لیکن اگر لوگ اس شناخت کے باعث آپ سے نفرت کرتے ہوں آپ کو کمتر جانتے ہوں تو پھر اپنا لباس چھوڑنا پڑتا ہے۔نیا چولا پہننا پڑتا ہے۔"

میں خاموش ہو جاتا ہوں۔

"ابو شلوار قمیض گھریلو لباس ہے۔اوپر سے ڈھائی تین گز کا دوپٹہ بڑا Cumbersome ہوتا ہے۔کبھی میز میں پھنستا ہے کبھی کرسی میں۔۔۔۔کام پر تو یہی جینز کام آتی ہے بہت پریکٹیکل،،،،"

میں ارجمند سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔

بیٹی بیٹی سے کوئی کیسے کہے کہ شلوار قمیض ستر پوش لباس ہے۔اگر دوپٹے کو سر

ڈھانکنے کے لئے استعمال کرو تو بھی یہ لبادے کا کام دیتا ہے۔۔۔مجھے یاد آیا کہ جب ہم ساندہ میں رہا کرتے تھے اور شاہد بھائی ایم اے او کالج جاتے تھے۔ان دنوں پتہ نہیں کیوں اور کیسے اماں نے اپنا بوسکی کا سفید شٹل کاک برقعہ اتار دیا اور چادر اوڑھنے لگی۔کچھ دیر آپیا نے دو حصوں والا nuns جیسا سیاہ برقعہ پہنا،لیکن جب تک ہم ساندھا چھوڑ کر ٹمپل روڈ تک پہنچے۔آپیا کا برقعہ بھی چوٹ چکا تھا اور وہ چوبر جی سکول میں چادر اوڑھ کر ہی جایا کرتی تھیں۔لباس انسان کی اندرونی تبدیلیوں کا ایک مظہر ہی تو ہے۔

گیراج کے اوپر بنی بیلکونی مین بیٹھ کر میں سارا دن تقابلی سوچوں میں گزارتا۔یہ سوچیں کبھی تفکرات میں بدل جاتیں،کبھی تضادات میں۔۔۔کبھی اپنی زندگی کو سمجھنے میں سہولت ملتی اور کبھی یہی سوچ مجھے الجھا کر رکھ دیتی۔ماضی کے لوگ واقعات نظریات یوں آتے،گویا میں رسی ناپنے کے عمل میں ہوں،میں رسی سے اچھل کر انہیں گزر جانے دیتا۔۔۔لیکن رسی پھر لوٹ آتی۔

سوچ بار بار آتی اور میں۔۔۔ناپتا رہتا

اچھلتا چلا جاتا۔بڑھاپے میں انسان کے پاس ان سوچوں کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا۔وہ اپنی گدڑی پھرولتا رہتا ہے،جوئیں تلاش کرنے میں وقت گزارتا ہے اور کسی طور بھی مطمئن نہیں ہوتا۔

بیلکونی سے کبھی کبھی مجھے ایک نوجوان نظر آتا۔وہ گھروں کی پرائیویٹ سڑک پر چلتا بس سٹاپ کی طرف جاتا دکھائی پڑتا۔میں نے پتہ کیوں اس کا نام کاشف رکھ لیا۔ہوسکتا ہے وہ مہندر پرکاش ہو۔یہ بھی ممکن تھا کہ یہ ہسپانوی نژاد احمد نامی نوجوان انسلد سے فراف ہونے والے مسلمان پرکھوں کی اولاد ہو۔وہ جو کوئی بھی تھا میں نے اس کو کاشف کا پیت سمہ دے کر اپنا لیا تھا سنا ہے آج سے ہزار سال پہلے جب ہسپانیہ

سے مسلمان فرار ہوئے تو انہوں نے امریکہ آ کر بسیرا کیا۔ وہی پہلے تارکین وطن تھے جنہوں نے کولمبس سے پہلے یہ جزیرہ دریافت کیا، کیوبا، میکسیکو، ٹیکساس اور نیو ادا میں مسجد میناروں اور قرآن آیات کے کھنڈرات ہیں۔ امریکہ اور کینیڈا میں ایسے لاتعداد شہر ہیں جن کے نام یہاں کے پہلے تارکین مسلمانوں نے رکھے واشنگٹن، نیویارک، اور ٹیکساس میں مدینہ مکرمہ نام کے شہر اس بات کے گواہ ہیں کہ یہاں کے ہسپانوی تارکین نے یہ نام اپنی عقیدت کے اظہار میں رکھے تھے،

جب تک میں کمروں میں چلتا پھرتا ہوں، بڑی ٹھس سی نارمل زندگی گزارتا ہوں فریج سے لفٹ اوورز نکال کر کھا لیے۔ واشنگ مشین میں کپڑے ڈال کر دھو لیے ٹیلیویژن پر کیبل کی مدد سے سٹیشن بدل بدل کر مختلف ٹوٹے دیکھ لیے۔ ایسے اخبار جو سیروں کے حساب سے دروازے کے ساتھ ہی پڑے رہتے ہیں، اٹھائے اور پڑھ لیے۔ لیکن جونہی میں بیلکونی میں جا بیٹھتا ہوں۔ میرے دماغ کا اینٹینا ایسی باتیں سوچنے لگتا ہے جو خود میرے لیے بڑی نئی ہوتی ہیں۔ عام طور پر بڑھاپے کے پاس مستقبل کے لئے کوئی پلان نہیں ہوتے۔ بوڑھے ولوے اور امید سے عاری اپنا منہ ماضی کی طرف کیے رکھتا ہوں۔ دیکھی بھالی گلیاں، جانے پہچانے چہرے۔ گزرے ہوئے موسموں پر تارچ پڑتی ہے تو وہ اپنے اندھیروں سے چونک پڑتا ہے۔ اسے لگتا ہے جیسے واقعات، حادثات، معمولات ماضی کا نہیں حال ہی کا حصہ ہوں۔ بوڑھا مستقبل سے صرف موت کی جھلکیاں دیکھتا ہے اور یہ حقیقت کچھ ایسی پر امید نہیں ہوتی۔

دوسری منزل پر ایک بیلکونی سی ہے۔ میرا بیدروم ہے اور اس کا ایک دروازہ بیلکونی میں کھلتا ہے۔ اس کی لمبائی کوئی دس بارہ فٹ اور چوڑائی قریباً چار سے چھ فٹ

ہے، یہ چھوٹی بیلکونی لکڑیوں کی کھچیوں سے بنی ہے ارجھکنے پر اس کی درزوں سے گیراج سے نکلتی گاڑیاں نظر آتی ہیں سامنے لکڑی کا جنگلا ہے۔اگر پاکستان ہوتا تو اس جنگلے پر تولیے، شلواریں، کھیس، بچوں کے جانگھیے، فراکس غرضیکہ ہر سائز اور نمونے کا کپڑا سا کھنے کے لئے پڑا رہتا۔۔۔اندرون شہر اور پرانی انارکلی میں کپڑے سکھانے کا یہ منظر عام طور پر نظر آتا ہے۔چھوٹی بچیاں بیلکونی میں بیٹھ گڑیوں سے کھیلتی ہیں۔جو ان لڑکیاں کپڑوں کی آڑ کے پیچھے کھڑی ہو کر بازار میں جھانکتی ہیں۔جو ان بازار والیاں ایسے ہی چھجوں پر ٹیک لگا کر نظر بازی اور ازاروں سے کام لے کر کمروں کا دھنا چلاتی ہیں۔یہ چھجے اندرون شہر کے کلچر، زندگی اور دھوپ کا منبع ہیں، لیکن اس پوش علاقے کہلاتے ہیں، ان کے رہن دار بھی خوشحال لوگ ہوتے ہیں۔

امریکہ میں مکان عموماً بنکوں کے پاس رہن ہوتے ہیں۔ایک مدت سود اور اصل زر کو قسطوں پر ادا کرتے رہنے سے بنک میں گروی رکھا ہوا گھر ذاتی ملکیت بنتا ہے۔

سفید آدمی اپنی زندگی زیادہ تر قرض پر کاٹتا ہے۔امریکہ مین ہیرے تک قسطوں پر مل جاتے ہیں۔ہمارے ہاں ابھی انسٹالمنٹ کا رواج اتنا عام نہیں اور ڈاؤن پے منٹ بھی آسانی سے ادا نہیں کی جس سکتی۔یہ گھر جو میری بیٹی اور داماد کا ہے امریکہ کے اعتبار سے کافی کشادہ ہے اور اس کی ڈاؤن پے منٹ کے بعد وہ ہر ماہ قریباً دو ہزار ڈالر کی قسط ادا کرتے ہیں اس کے علاوہ کچھ فرنیچر، ڈی وی ڈی، کیبل، کار نہ جانے کتنا کچھ قسطوں پر ہے۔قرض کی مئے پینے کے بعد ان دونوں کو فاقہ مستی پر کوئی گلہ نہیں ہوتا، بلکہ وہ بڑے خوش و جزبے کے ساتھ امریکہ کے گن اور پاکستان کے اوگن بیان کرنے میں مشغول رہتے ہیں۔قرض پر معیار زندگی وقت سے پہلے حاصل کر کے وہ پھولے نہیں سماتے۔بلکہ سمجھتے ہیں انہوں نے بدقسمتی کو جل دے دیا ہے۔

یہاں بیلکونی میں پلاسٹک کی کرسی پر بیٹھ کر میں سامنے والی بلڈنگ اور خوبصورت

ڈھلی ڈھلائی سڑک، آنے جانے والے لوگ اور اپارٹمنٹس میں بسنے والوں کی آمد و رفت کو دیکھتا رہتا ہوں۔ یہ منظر میرے سلور سکرین کا کام دیتا ہے۔

میرے دماغ کی سکرین پر امریکہ اور پاکستان دونوں باری باری اور کبھی ساتھ ساتھ بھی چلتے ہیں۔ میرے اردگرد کپلنگ کا مقولہ گھومتا رہتا ہے کہ مغرب مغرب ہے اور مشرق مشرق، یہ دونوں کبھی نہیں مل سکتے۔

سوچتا ہوں مل بھی کیسے سکتے ہیں؟ مشرق میں جب سورج چڑھتا ہے، مغرب میں اسی وقت آغاز شب کا منظر ہوتا ہے۔ سورج انسان کے دن اور رات کو متعین کرنے والا ہے۔ پھر جب ایک رات ہو اور دوری جگہ سورج کی کرنیں پھیلی ہوں تو بھلے ہی سارے فرق مٹا دیئے ایک مخلوق سوتی ہے دوسری جگہ بیداری ہوتی ہے۔ فاصلے کم ہونے میں نہیں آتے۔

مشرق کے لوگوں کی رنگت اور مغربی لوگوں کی جلد دوسرا فاصلہ ہے جسے عام انسان پاٹ نہیں سکتا۔

لیکن سب سے بڑی مشکل آج کے عہد میں ترقی کی ہے۔۔۔۔ ایک وقت تھا جب مشرق میں سورج بھی اگتا تھا۔ جاگرتی بھی تھی اور مشرق روحانی طور پر مغرب سے زیادہ ترقی یافتہ بھی تھا لیکن اب ترقی کا تصور بالکل بدل چکا ہے۔۔۔ اب ترقی دنیاوی مادی

اور مال کی ہے۔ مشرق اس ترقی کا تصور بھی ٹھیک طور پر نہیں کر سکتا۔ ایک زمانہ تھا جب مشرق نے ساری دنیا کو فلاح کی ترقی عنایت کی تھی اور واضح بات ہے کہ مذہب صبر، توکل، بھائی چارہ، محبت، اخوت جیسے اصول اپنانے پر ابھارتا ہے۔ خواہشات کو دبانا، اسراف سے بچنا، مسابقت میں نہ پڑنا، فسادانہ پھیلانا، نمائش سے گریز انا کی

سرکوبی فلاح کے لیے اہم ہیں۔آج کے زمانے میں معاشی ترقی کے لیے اصول ان کے برعکس ہیں۔اسراف اس ترقی کا سنگ بنیاد ہے۔خواہشات کی کھڑکیاں ہمیشہ کھلی رہیں تو ترقی ہوتی ہے۔روپیہ گھر سے بازار تک آتا جاتا رہے مسابقت وہ تیل ہے جو ترقی کی مشینی گراریوں میں پڑتا رہے تو مشین چلتی ہے۔یہاں صب توکل نام کا دیا نہیں جلتا۔جو کچھ ہونا ہے ابھی اسی وقت اسی لمحے کی گھنٹی بجاتا ہے،اس بے کلی سے رفتار پیدا ہوتی ہے،سڑکوں پر ٹریفک جیم تیار ہوتا ہے،سیڑھیوں متروک ہوتی ہیں لفٹیں اوپر نیچے آتی ہیں گھڑی بار بار دیکھنا اور کار میں دروازے کھلنے والے ہینڈل پر ہاتھ رکھ کر سفر کرنے کا رواج بڑھتا ہے۔انسان بے قرار نہ ہو تو ترقی نہیں کر سکتا۔دوسروں کو مار گرانے کا جوڈو کراٹے نہ آئے تو آگے بڑھ نہیں سکتا۔روپے سے محبت پیدا نہ ہو سکے تو ترقی کا تصور حاصل نہیں کر سکتا۔اسراف،مسابقت،خواہشات،کا پٹا تیزی سے چلے تو زمانے کی پٹڑی پر ترقی فل سپیڈ چلتی ہے۔

مشرق کی روحانی ترقی اور چیز تھی

اور مغرب کی معاشی ترقی اور علم ہے۔۔۔۔مغرب کی شاہراہ مادی دنیاوی تروی ہے اور مشرق کی پگڈنڈیاں فلاح کی جانب نکلتی ہیں۔جہاں تک میرا ہیلکونی کا علم ہے میں سمجھ پایا ہوں کہ ہماری روح جسم میں پنجرے کے طوطے کی طوح قید ہے روح مجبوراً طوعاً

وکرہاً اس پنجرے میں رہتی ہے۔طوطے کو قطعی پروا نہیں کہ پنجرے پر کیا گزرتی ہے۔یہ چاہے سونے کا ہو،اسے صرف اسی وقت آزادی میسر آسکتی ہے جب پنجرہ چھوڑ کر طوطے اپنے راستے جا نکلے۔نہ پنجرے کو اس بات کی پریشانی ہوتی ہے کہ اس کی سلاخوں کے اندر ایک سر پٹکے تیلیوں سے ٹکرانے والی روح کون ہے،کیا ہے۔نہ

ہی روح پلٹ کر دیکھتی ہے کہ پنجرے پر کیا اور کیوں گزری۔

نئی ترقی کی تمام تر توجہ پنجرے پر ہے۔اسے طوطے کی پرواہ نہیں۔پنجرے کا ڈیزائین، رنگوروغن، اس کے اردگرد زیبائش، آسائش کا ہر ممکن فارمولا آج کی سوچ پر حاوی ہے۔۔۔۔انسان اپنے جسم اور اس کی ضرورتوں میں اس درجہ مگن ہوگیا ہے کہ اسے اس جسم کی کوٹھڑی میں محبوس قیدی کی پرواہ نہیں رہی۔کھانا۔پہننا، اوڑھنا، بچھونا اب Priority میں مقدم ہیں۔وہ جسم سے وابستہ ہوکر بازاروں کا رمتا جوگی بن گیا ہے۔انڈسٹری، میڈیا، انٹرنیٹ، بانگ دہل انسان کو اس کی ضروریات کا احساس دلاتے رہتے ہیں۔اب خواہشات کو دبانا، مسابقت سے پرہیز کرنا فساد سے ہاتھ اٹھانا نئی ترقی کے گناہ ہیں تمام رشتے، اقدار، رسم و رواج، تہذیبی فارمولے، مذہبی احکامات منہ اٹھائے انسان سے علیحدہ علیحدہ گھومتے پھرتے ہیں جیسے گریب رشتہ دار گاؤں سے آکر شہری رشتہ داروں کے گھر قیام پزیر ہوں اور نہ جانتے ہوں کہ انہیں قیام جاری رکھنا ہے کہ واپس لوٹ جانا ہے۔۔۔۔ان کا رشتہ اصلی ہے کہ جعلی۔وہ ایک ہی درخت کی شاخیں ہیں بھی کہ نہیں؟

نئی ترقی کے پاس وی بل ڈوزر ہے جو مذہبی باڈھوں کو اکھاڑتا پچھاڑتا ہموار کرتا چلا جاتا ہے۔صرف محنت کا عزم اور کام کی اخلاقیات کے رولز پکڑا کر اپنا راستہ سیدھا کرلیتا ہے اور نئی سڑکوں پر ہیومن رائٹس کی کولتار بچھا کر انسان کو جس قدر زیادہ مشینی اور وقت کا پابند بنا سکے۔بنا ڈالتا ہے۔اس بل ڈوزر تلے کیا کچھ پس جاتا ہے اس کی پرواہ نہیں۔اقدار، رسم و رواج، مذہب کے پھول اکھاڑ کر وہ گھاں گھاں کرتا آگے بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔

تھرڈ ورلڈ کے لوگ عام طور پر مسلمان ممالک خصوصی طور پر اپنی نالائقی پر بہت بسیمان ہیں۔وہ ایٹم بم بنا کر بھی احساس کمتری سے چھٹکارا حاصل نہیں سکتے۔جب ترقی کا حالیہ نسخہ ان کے ہاتھوں میں آتا ہے تو احساس ضرم وے وہ سٹ پٹا کر مسجد کی

طرف بھاگتے ہیں۔جب نئی ترقی کا جن ان کے دروازہ پر دستک دیتا ہے تو وہ اسے وارنٹ سے کم نہیں سمجھتے۔نیوٹن کے اصول کے تحت ترقی کا عمل ردعمل میں بدلتا ہے ۔پھر اسلامی تحریکیں چلتی ہیں۔چاند تارے والے علم لہرائے جاتے ہیں۔جہاد کا نعرہ لگتا ہے۔مجاہدین کو دہشت گرد کا الزام سہنا پڑتا ہے۔روحانی ترقی کے خواہشمند بنیاد پرست کہلاتے ہیں۔خود ان ہی کے بھائی بند جو نئی ترقی کو انسان کی بلندی کا واحد راستہ سمجھتے ہیں۔ادا بدا کر ایسے لوگوں کو جاہل، ان پڑھ، روایت پسند، لکیر کے فقیر سمجھ کر ان سے اپنی زندگی کا دھارا الگ کر لیتے ہیں۔اغیار کی لعن طعن سے تو فلاح پسند لوگ دل برداشتہ نہیں ہوتے لیکن اپنوں کے الزام ان کے دلوں میں میخیں بن کر گڑ جاتے ہیں۔

جہاد جو نماز کی طرح بنیادی ارکان مین سے ہے اسی جہاد کے لیے وہ اپنے لیے اور غیروں کے حضور تاویلیں پیش کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور سمجھا نہیں پاتے کہ بنیادی ارکان انسان کی مرضی کے پابند نہیں۔مشکل یہ ہے کہ انہیں بھی علم نہیں ہوتا کہ وہ پنجرے کے طوطے کو اڑنے سے پہلے آزاد نہیں کرا سکتے اور نئی ترقی کا دلدادہ سوائے پنجرے کے بیرونی ماحولیات کے اور کوئی علم نہیں رکھتا۔۔۔اس کے لئے روزگار ،جسمانی صحت، تعلیم، آزادی نسواں، پولیوشن، بنیادی ہیں۔وہ جسمانی سہولتوں سے آگے ہر سفر کو خلائی سفر سمجھتا ہے۔

میں بیلکونی کی کرسی کھسکا کر آگے جنگلے تک لے جاتا ہوں اس طرح میری ٹھوڑی جنگلے سے چھ انچ کے فاصلے پر ہے۔میں یونانی بڈھے کی بیلکونی سے قریباً ساٹھ فٹ دور ہوں نیچے گندی گاڑہ کھڑی ہے اور اس کے ورکر بڑی چابکدستی سے پلاسٹک کے تھیلے اٹھا اٹھا کر گند گاڑی میں ڈال رہے ہیں۔سوچتا ہوں امریکی لوگ اپنے اپنے کام کو اتنی چستی سے کیسے کر لیتے ہیں؟ کیا سفید فارم لوگ قدرتی طور پر رزق

حلال کمانے کے شوقین ہیں؟ کیا ان کے مذہب نے انہیں سچائی سکھائی ہے؟

کیا وجہ ہے کہ پاکستان میں خصوصی طور پر اور عام طور پر سارے تھرڈ ورلڈ میں نظام نہیں چلتے؟

کیا ہمارے نظام کے اندر ہی کچھ ایسے بدیہی اور چھپے ہوئے پھندے ہیں جن میں انسان پھنس جاتا ہے؟ یا بنیادی طور پر ہماری فطرت نافرمان ہے؟

کیا رشوت، سفارش، دھاندلی کا تعلق ہماری تربیتوں کا نتیجہ ہے؟

کیا واقعی درست تربیت کے بغیر معاشرہ بنا کر ہم پراگندہ حال ہوئے۔ امریکی ترقی کی دیوی کے پرستار ہیں تو اس دیوی نے انہیں مالا مال بھی کیا ہے۔ بہت غور سے سوچنے کے بعد مجھ پر منکشف ہوا کہ امریکہ کو ڈاکوؤں نے بسایا تھا۔ ڈاکو کی کچھ بنیادی خصوصیات دلیر، بہادر اور زبردستی ہیں وہ جب کسی چیز کو ہتھیانا چاہتا ہے تو اپنے آپ کو سینہ زوری پر ابھارنا اس کے لیے مشکل نہیں ہوتا۔ امریکہ کو جب سڑکیں بنانے، جنگل کاٹنے اور اشیاء کی بھرمار کرنے کی ضرورت تھی اس نے جال ڈال کر نیگرو لوگوں کو ہتھیا کر جہازوں میں لادا اور امریکہ کی سرزمین پر سرگرداں پھینک دیا۔ جب امریکی لوگوں کو اس سرزمین پر قابض ہونے کی خواہش نے ستایا تو ریڈ انڈین کو امریکی تاریکن نے چن چن کر ختم کیا۔ جب انہیں انگریزی زبان لوٹنے کی ضرورت پیش آئی تو انگریز علم یو اپنایا کہ اس کا لب ولہجہ، حروف کے لہجے اور slang کا اضافہ کر کے ایک ایسی زبان ایجاد کی کہ انگریز بھی اس اجنبی انگریزی سے ششدر رہ گئے۔ امریکی ڈاکو اگر ترس ہو تو رابن ہڈ کہلاتا ہے۔ اگر عالم ڈاکو ہو تو اس کو تہس نہس کرنے والا دہشت گرد کہا جا سکتا ہے۔ اسے آپ جرثومہ کا کرشمہ کہیں یا پرکھوں کے رسم ورواج کی پروی یا امریکی مزاج کی خوبی لیکن یہ بات واضح ہے کہ کسی خطہ کے بسنے والوں کی عام سائیکی ایک ہی ہوتی ہے۔ جمشید اور قیصر دونوں مسلسل گھنٹی بجا رہے ہیں۔ ان کو

خوشنودی حاصل کرنے کے لئے میں ساری سوچوں کو کرسی پر رکھ کر اندر بھاگتا ہوں۔

ارجمند ایک یہودی امریکن ڈاکٹر کی Reseptionist ہے جو بظاہر بہت لبرل آدمی ہے، لیکن صبح روانگی کے وقت ارجمند کے چہرے پر ایسا ملال ہوتا ہے جس کا کوئی نام نہیں۔۔۔۔جو صرف اسی وقت چہرے پر آتا ہے جن کوئی شخص آپ کو نہ سمجھے اور آپ کو کمتر جانے۔ارجمند بروقت پہنچنا چاہتی ہے لیکن عموماً بچے اس کے ساتھ ہوتے ہیں۔وہ گھر

سے نکلتے ہی آوازوں میں بدل جاتی ہے اور ارجمند نہیں رہتی۔وہ یہودی امریکن ڈاکٹر کے خوف سے ناشتہ نہیں کھاتی، ہاتھ میں سینڈوچ رکھتی ہے اور ڈرائیو کرتے ہوئے کھاتی جاتی ہے۔راستے میں ہی بال بھی برش کرتی ہے اور کار کے آئینے میں دیکھ کر لپ سٹک لگا لیتی ہے۔

برصغیر تفرقے پر چلتا ہے۔یہاں صدیوں سے پیشوں کے اعتبار سے ذات پات نے لوگوں کو بانٹ رکھا ہے۔پاکستان بننے کے بعد امید کی جاتی تھی کہ لوگ بھائی چارہ اپنائیں گے اور پاکستانی معاشرہ اسلام کے بنیادی اصول مساوات کا مظہر ہو سکے گا ۔لیکن بدقسمتی سے پاکستانی لوگوں کا خمیر ان لوگوں سے اٹھا ہے جو اونچ نیچ کو روا رکھتے ہیں۔اسی لیے یہاں کئی قسم کے تفرقات نے سر اٹھایا۔لسانی، جغرافیائی ۔نسلی، تعلیمی، خواتین کی آزادی، رسم و رواج کے تغیرات، ذات پات کی اونچ نیچ ،مذہبی بوقلمونی، طبقاتی نزاع ان سب نے مساوات کے بنیادی اصول کو اپنا نہیں سکا اسی لیے یہاں کے معاشرے کی شناخت اختلاف، تفرقہ اور اونچ نیچ میں منتج ہوئی اور امریکہ ڈاکو کی ذہنیت کو اپنے جرثومہ میں چھپائے پھرتا ہے۔امریکی اب بھی ڈاکو کی